قرآن کریم کا معجزانہ اسلوبِ بیان (سورۃ الحِجر)

مولانا محمد عارف جمیل قاسمی مبارک پوری
استاذ دارالعلوم دیوبند

قرآن کریم وہ معجزاتی کتاب ہے، جس کی ہم مثل چند آیتیں پیش کرنے سے بھی آج تک دنیا بے بس وعاجز ہے، اور نبینا محمد ﷺ کا وہ معجزہ ہے جو روزِ بعثت سے آج تک سارے عالم کے لیے چیلنج بنا ہوا ہے، ماضی میں کتنی ہی بار اس جیسی آیات پیش کرنے کی ناکام وناپاک کوشش کی گئی؛ لیکن ساری کوششیں ''خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ'' کا مصداق بنیں۔ قرآن کریم پڑھتے ہوئے بہت سے الفاظ وکلمات پر آدمی رک جاتا ہے اور اس کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب قرآن کریم ایجاز واعجاز دونوں صفات کی حامل کتاب ہے، تو بہت سی بدیہی باتوں کو ذکر کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ یا بہت سے الفاظ وحروف ایسے آئے ہیں، جن کے بغیر کلام پورا ہوتا ہے اور ان کا ذکر کرنا قرآن کریم کے ایجاز واختصار کے منافی ہے۔ زیر بحث مضمون میں بہ طور مثال ''سورۃ الحِجر'' میں موجود اس طرح کے سوالات کا جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

❶-فرمانِ باری:

''وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ''

''ہم نے جتنی بستیاں ہلاک کی ہیں، ان سب کے لیے ایک معیّن وقت نوشتہ ہوتا رہا ہے۔''

''وَلَهَا كِتَابٌ'' میں واو کے اضافہ کا فائدہ

یہاں پر ''وَلَهَا كِتَابٌ'' میں واو آیا ہے، حالاں کہ اس کے بغیر بھی کلام مکمل تھا، پھر اس کا کیا فائدہ؟

اس کا جواب یہ ہے کہ قیاس کا تقاضا تو یہی ہے کہ واو کے بغیر آئے، جیسا کہ ایک دوسری آیت میں آیا ہے: ''وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا لَهَا مُنْذِرُوْنَ'' (الشعراء:۲۰۸)، یہاں واو آنے کا فائدہ، موصوف کے ساتھ صفت کے اتصال کو مؤکد کرنا ہے، مثلاً کہا جاتا ہے: ''جاء ني زيد عليه ثوب، وجاء ني

وعليه ثوب ،،(۱)

ابن عطیہؒ فرماتے ہیں:

یہاں پر واو حالیہ ہے۔اس کے بعد ابن المنذرؒ کا یہ قول نقل کیا کہ یہ وہی واو ہے جو بتاتا ہے کہ واو کے بعد کی حالت اس سے پہلے کی حالت ہی ہے، جیسا کہ اس فرمان باری میں ہے: ''حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْهَا وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا'' (الزمر:۷۳) (۲)

❷-فرمانِ باری:

''وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِيْنَ''

''اور ہم تمہارے اگلوں کو بھی جانتے ہیں اور ہم تمہارے پچھلوں کو بھی جانتے ہیں۔''

فعل ''وَلَقَدْ عَلِمْنَا'' دوبارہ لانے کا فائدہ

یہاں پر فعل ''وَلَقَدْ عَلِمْنَا'' دوبار آیا ہے، اس میں کیا حکمت ہے؟

ابوالسعودؒ نے اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا:

فعل ''وَلَقَدْ عَلِمْنَا'' کے مکرر لانے میں جو کمالِ تاکید پر دلالت ہے، وہ مخفی نہیں۔ (۳)

❸-فرمانِ باری:

''فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ''

'' سو سارے کے سارے فرشتوں نے (آدمؑ کو) سجدہ کیا۔''

''اَجْمَعُوْنَ'' کے ذریعہ دوبارہ تاکید لانے کا فائدہ

تاکید کا مفہوم ''كُلُّهُمْ'' سے حاصل تھا، پھر ''اَجْمَعُوْنَ'' کے ذریعہ دوبارہ تاکید لانے کا کیا فائدہ ہے؟

اس کے کئی جوابات دیے گئے ہیں:

اول: خلیلؒ اور سیبویہؒ نے کہا کہ ''كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ'' تاکید در تاکید ہے۔ (۴)

ابوحیانؒ نے ابن عطیہؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ''اَجْمَعُوْنَ'' تاکید ہے اور اس میں حال کا معنی پایا جاتا ہے۔اس میں ان لوگوں کے قول کی طرف میلان ہے جو کہتے ہیں کہ ''اَجْمَعُوْنَ'' اتحادِ وقت پر دلالت کرتا ہے؛ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ ''اَجْمَعُوْنَ'' کا مفہوم وہی ہے جو ''كُلُّهُمْ'' کا ہے۔ (۵)

ابوالسعودؒ کہتے ہیں:

''كُلُّهُمْ'' یعنی ان میں سے کوئی نہیں چھوٹا، اور ''اَجْمَعُوْنَ'' یعنی ان میں سے کوئی بھی کسی سے پیچھے نہیں رہا اور صرف حال ہی یہ معنی نہیں دیتا؛ بلکہ تاکید بھی یہ معنی دیتی ہے؛ کیوں کہ اشتقاقِ واضح سے معلوم

ہوتا ہے کہ اس میں جمعیت اور معیت کا معنی وضع کے اعتبار سے ہے، اور خطاب میں اصل یہ ہے کہ اس کو کسی چیز کی کامل ترین حالت پر اُتارا جائے اور بلاشبہ ساتھ ساتھ سجدہ کرنا سجدہ کی کامل ترین نوع ہے؛ لیکن اس کا استعمال تاکید کے لیے شائع ہے اور اس کو احاطہ کا معنی دینے میں (کل) کے قائم مقام رکھا گیا ہے، اس میں کمال کو نہیں دیکھا گیا اور اگر اِحاطہ دوسرے الفاظ سے سمجھ میں آجائے، تو کلام کو لغو سے بچانے کے لیے اصل کی رعایت ناگزیر ہے۔ (۶)

دوم: مبردؒ سے اس آیت کے متعلق دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ اگر یوں کہتے: ''فَسَجَدَ الْمَلٰئِكَةُ'' تو احتمال باقی تھا کہ بعض نے سجدہ کیا ہو، جب ''كُلُّهُمْ'' کہہ دیا تو یہ احتمال زائل ہوگیا اور معلوم ہوگیا کہ سب نے سجدہ کیا ہے، اس کے بعد ایک اور احتمال رہ جاتا ہے، وہ یہ کہ کیا سب نے یکبارگی سجدہ کیا اور ہر ایک نے الگ الگ وقت میں سجدہ کیا؟ لہٰذا جب ''اَجْمَعُوْنَ'' کہہ دیا تو معلوم ہوگیا کہ یکبارگی سجدہ کیا ہے۔ علامہ زجاجؒ نے مبردؒ کا یہ قول نقل کرنے کے بعد فرمایا: خلیلؒ اور سیبویہؒ کا قول اس سے بہتر ہے؛ اس لیے کہ ''اَجْمَعُوْنَ'' معرفہ ہے، لہٰذا حال نہیں ہوگا۔ (۷)

❹-فرمانِ باری:

''اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِيْنَ.''

''بے شک خدا سے ڈرنے والے (یعنی اہلِ ایمان) باغوں اور چشموں میں (بستے) ہوں گے، تم ان میں سلامتی اور امن کے ساتھ داخل ہو۔''

یہاں پر بدیہیات کے دو مقام ہیں:

①-مقامِ اول: جنت میں ہونے کے باوجود، داخل ہونے کا حکم دینے کا فائدہ

پہلی آیتِ کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جنتوں اور باغات میں ہوں گے، پھر اس کے بعد ''اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِيْنَ'' میں داخل ہوجانے کا کیا مطلب ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ وہ بہت ساری جنتوں میں ہوں گے اور جب ایک جنت سے دوسری جنت میں جانا چاہیں گے تو کہا جائے گا: ''اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِيْنَ''۔ (۸)

②-مقامِ دوم: ''بِسَلٰمٍ'' کے بعد ''اٰمِنِيْنَ'' لانے کا فائدہ

''بِسَلٰمٍ'' کے لفظ سے معلوم ہوگیا کہ ان کا داخلہ سلامتی وامن کے ساتھ ہوگا، پھر ''اٰمِنِيْنَ'' کہنے میں کیا حکمت ہے؟ اس کے کئی جوابات دیے گئے ہیں:

اول: سلامتی سے مراد جسمانی سلامتی اور امن سے مراد دوسری سلامتی ہے۔ (۹)

دوم: امام رازیؒ فرماتے ہیں:

''اُدۡخُلُوۡهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِيۡنَ'' سے مراد یہ ہے کہ فی الحال تمام آفات سے سلامتی کے ساتھ جنت میں داخل ہوجاؤ، اسی کے ساتھ یہ قطعی ہے کہ یہ سلامتی باقی رہے گی اور اس کے زوال سے امن ہوگا۔ (۱۰)

علامہ آلوسیؒ فرماتے ہیں:

''بِسَلٰمٍ'' سے مراد فی الحال آفت سے سلامتی اور ''اٰمِنِيۡنَ'' سے مراد آئندہ آفت آنے سے امن کے ساتھ داخل ہوجاؤ۔ (۱۱)

سوم: ''بِسَلٰمٍ'' سے مراد یہ ہے کہ تم کو سلام کیا جائے گا اور یہ ''اٰمِنِيۡنَ'' کے مفہوم سے مختلف ہے۔ (۱۲)

❺ -فرمانِ باری:

''قَالَ اَبَشَّرۡتُمُوۡنِىۡ عَلٰٓى اَنۡ مَّسَّنِىَ الۡكِبَرُ فَبِمَ تُبَشِّرُوۡنَ''

'' ابراہیم علیہ السلام کہنے لگے کہ: کیا تم مجھ کو اس حالت پر (فرزند) کی بشارت دیتے ہو کہ مجھ پر بڑھاپا آ گیا ہے؟ سو کس چیز کی بشارت دیتے ہو؟''

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سے بہ ظاہر استبعاد کی وجہ

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کس طرح، بڑھاپے میں اولاد پیدا کرنے پر اللہ کی قدرت کو بعید سمجھا؛ حالاں کہ اللہ کی قدرت کا انکار حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شایانِ شان نہیں؟ اس کے کئی جوابات دیے گئے ہیں:

اول: امام رازیؒ فرماتے ہیں:

قاضی صاحبؒ (باقلانی) نے فرمایا کہ اس کا سب سے بہتر جواب یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقصد یہ معلوم کرنا تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کو یہ اولاد، بڑھاپے کو باقی رکھتے ہوئے عطا کریں گے یا ان کو دوبارہ جوان بنادیں گے، پھر اولاد عطا کریں گے اور اس سوال کی وجہ یہ ہے کہ مکمل بڑھاپے کی حالت میں عادتاً اولاد نہیں ہوتی؛ بلکہ جوانی میں ہوتی ہے۔ (۱۳)

دوم: زمخشری کہتے ہیں:

مطلب یہ ہے کہ کیا تم مجھے بڑھاپے کے ساتھ اولاد کی بشارت سنا رہے ہو، یعنی بڑھاپے میں اولاد ہونا عادتاً عجیب وغریب بات ہے، ''فَبِمَ تُبَشِّرُوۡنَ'' یہ ما استفہامیہ ہے، اس میں تعجب کا معنی آ گیا ہے، گویا وہ یہ کہہ رہے کہ تم مجھے کون سے عجوبے کی بشارت سنا رہے ہو، یا یہ کہنا چاہتے ہیں کہ تم مجھے عادتاً غیر متصور چیز کی بشارت سنا رہے ہو، یعنی تم کسی حقیقی بات کی بشارت نہیں سنا رہے ہو، اس لیے کہ اس طرح بشارت، عدم کے درجہ میں ہے۔ (۱۴)

ابن عاشور کہتے ہیں:

''علی''، ''مع'' کے معنی میں ہے، جو بڑھاپا آنے کے ساتھ بشارت کے شدتِ اتصال واقتران کو بتا رہا ہے، اور آیت کا مطلب، بڑھاپے میں اولاد کی بشارت پر تعجب کرنا ہے، اور اس تعجب کو دوسرے استفہام ''فَبِمَ تُبَشِّرُوْنَ'' کے ذریعہ مؤکد کیا گیا ہے، انہوں نے ایک معلوم شدہ عجیب چیز کو غیر معلوم کے درجہ میں رکھ دیا ہے؛ کیوں کہ یہ قریب قریب غیر معلوم چیز ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بشارت کے ذریعہ یہ معلوم ہو گیا تھا کہ وہ فرشتے ہیں، لہٰذا یہ استفہام متعین طور تعجب کے لیے ہے۔ (۱۵)

سوم: امام زمخشری کہتے ہیں:

ہوسکتا ہے کہ یہ صورت اور ذریعہ کا سوال ہو، یعنی کس صورت میں تم مجھے اولاد کی بشارت سناتے ہو، اس طرح کی بشارت کی عادتاً کوئی صورت نہیں ہے۔ (۱۶)

❻-فرمانِ باری:

''قَالُوْا بَشَّرْنٰكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ''

''وہ (فرشتے) بولے کہ ہم آپ کو امرِ واقعی کی بشارت دیتے ہیں، سو آپ نا اُمید نہ ہوں۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام مایوس نہیں تھے اس کے باوجود ممانعت کا فائدہ

یہ معلوم ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نا اُمید نہیں تھے، پھر ان کو نا اُمیدی سے روکنے کا کیا فائدہ ہے؟

ابوحیانؒ نے اس کا یہ جواب دیا کہ: ''فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ'' نہی ہے اور کسی چیز سے نہی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مخاطب اس میں ملوث یا اس سے مقترن ہے اور ''وَمَنْ يَّقْنَطُ'' ان کا جواب ہے اور یہ بتانا ہے کہ بشارت کے بارے میں کلام کا مطلب نا اُمیدی نہیں ہے؛ بلکہ یہ استبعاد کے طور پر ہے، جیسا کہ عادت جاری ہے، اس میں یہ اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بڑی عمر میں بچہ ملنا اللہ کی رحمت ہے؛ کیوں کہ والد کو تقویت دے گا اور ان کی پشت پناہی کرے گا؛ جب کہ وہ اکیلے یہ کام نہیں کر سکتے، نیز ان کے علم ودین کا وارث ہوگا۔ (۱۷)

علامہ آلوسیؒ کہتے ہیں:

''فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ'' یعنی خرقِ عادت سے مایوس نہ ہوں؛ کیوں کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے ہاتھوں خوارقِ عادت کا ظہور کثرت سے ہوتا ہے، حتیٰ کہ ان حضرات کے لیے یہ خارق عادت نہیں مانا جاتا۔ (۱۸)

❼-فرمانِ باری:

''قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ''

''فرمانے لگے: (تو یہ بتلاؤ کہ) اب تم کو کیا مہم درپیش ہے اے فرشتو!۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سوال کا فائدہ

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو معلوم ہوگیا تھا کہ وہ اولاد کی بشارت سنانے آئے تھے، تو اس سوال کا کیا فائدہ ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دیکھا کہ وہ جماعت کی شکل میں آئے ہیں، جو کسی اہم بڑے کام کے لیے ہوگا؛ کیوں کہ صرف بشارت سنانے کے لیے ایک فرشتہ بھی کافی تھا، چناں چہ انہوں نے پوچھا تو فرشتوں نے قومِ لوط کا معاملہ ذکر کیا۔ (۱۹)

❽-فرمانِ باری:

''وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ۔''

''اور ہم نے آپ کو سات آیتیں دیں جو (نماز میں) مکرر پڑھی جاتی ہیں اور قرآنِ عظیم دیا۔''

عطف الشيئ على نفسه کا فائدہ

''وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ'' کا ''سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ'' پر عطف، عطف الشیء علی نفسہ کی قبیل سے ہے، جو درست نہیں؛ اس لیے کہ معطوف اور معطوف علیہ میں مغایرت ضروری ہے؟

اس کے دو جواب دیے گئے ہیں:

اول: ''سَبْعًا'' سے مراد سورتِ فاتحہ یا طوالِ مفصل سورتیں ہیں اور ان کے علاوہ کو ''الْقُرْاٰنَ'' کہا گیا ہے؛ کیوں کہ قرآن کا لفظ جس طرح پورے قرآن پر بولا جاتا ہے، اسی طرح بعض قرآن پر بھی بولا جاتا ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ نے سورۂ یوسف کے بارے میں فرمایا: ''بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ'' یعنی سورت یوسف۔ (۲۰)

دوم: آیت کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو وہ چیز جس کو سبع مثانی کہا جاتا ہے دی گئی اور قرآن عظیم دیا گیا، یعنی جس کے اندر یہ دونوں صفات ہیں: ثناء یا بار بار پڑھی جانے والی اور عظمت والی۔ (۲۱)

امام رازیؒ کہتے ہیں:

صحیح جواب یہ ہے کہ کسی چیز کا بعض حصہ، اس کے مجموعہ سے الگ ہے، تو اس قدر مغایرت ہی عطف کے بہتر ہونے میں کافی کیوں نہ ہو؟ واللہ اعلم۔ (۲۲)

ابن عاشورؒ کہتے ہیں:

''الْقُرْاٰنَ'' کا ''سَبْعًا'' پر عطف، عطف الکل علی الجزء کی قبیل سے ہے؛ اس کا مقصد تعمیم ہے، تاکہ یہ معلوم ہوجائے کہ پورے قرآن کا عطا کیا جانا بہت بڑی نعمت ہے (۲۳)

❾-فرمانِ باری:

''وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنُ''

''اور آپ اپنے رب کی عبادت کرتے رہیے، یہاں تک کہ آپ کو موت آجائے۔''

''حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنُ'' کی قید کا فائدہ

ہر آدمی جانتا ہے کہ موت کے بعد عبادات ساقط ہوجاتی ہیں، اس کے بعد کوئی عبادت نہیں، پھر آپ ﷺ کو موت آنے تک عبادت کرنے کا حکم دینے میں کیا حکمت ہے؟ اس کے کئی جوابات دیے گئے ہیں:

اول: امام رازیؒ فرماتے ہیں:

''اس سے مراد یہ ہے کہ آپ پوری زندگی اپنے رب کی عبادت کرتے رہیے، زندگی کا کوئی لمحہ اس سے خالی نہیں ہونا چاہیے، واللہ اعلم۔''(۲۴)

زمخشری کہتے ہیں:

''یقین یعنی موت آنے تک اپنے رب کی عبادت پر قائم ودائم رہیے، یعنی جب تک جی میں جی ہے، اس کی عبادت میں خلل نہ آئے۔''(۲۵)

دوم: ابن عاشورؒ فرماتے ہیں:

''یقین قطعی اور غیر مشکوک چیز سے مراد، وہ مدد ہے، جس کا اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی سے وعدہ فرمایا تھا۔''(۲۶)، لہٰذا اشکال وارد ہی نہیں۔

حواشی

۱-زمخشری ۳/۲۹۸۔ ۲-ابن عطیہ ۴/۱۱۷۔ ۳-ابوسعود ۴/۷۱۔
۴-رازی ۹/۳۰۵۔ ۵-ابوحیان ۷/۱۹۵۔ ۶-ابوسعود ۴/۷۳۔
۷-رازی ۹/۳۰۵۔ ۸-الروض الریان، ص ۱۷۳۔ ۹-آلوسی ۱۰/۱۸۔
۱۰-رازی ۹/۳۱۶۔ ۱۱-آلوسی ۱۰/۱۸۔ ۱۲-ابوسعود ۴/۸۰؛ آلوسی ۱۰/۱۸۔
۱۳-رازی تفسیر آیت؛ مسائل الرازی، ص ۱۷۶۔ ۱۴-رازی تفسیر آیت۔
۱۵-ابن عاشور تفسیر آیت۔ ۱۶-حوالہ بالا۔ ۱۷-ابوحیان ۷/۱۹۸۔
۱۸-آلوسی ۱۰/۲۸۔ ۱۹-الروض الریان، ص ۱۷۷۔ ۲۰-زمخشری ۳/۳۲۳۔
۲۱-حوالہ بالا۔ ۲۲-رازی تفسیر آیت۔ ۲۳-ابن عاشور تفسیر آیت۔
۲۴-رازی تفسیر آیت۔ ۲۵-زمخشری تفسیر آیت۔ ۲۶-ابن عاشور تفسیر آیت

(بشکریہ ماہنامہ دارالعلوم دیوبند)